امتحانی مشق نمبر 1

(یونٹ 1 تا 6)

سوال 1- ''ظہور قدسی'' میں شبلی کے اسلوب کا بیان کا جائزہ لیجیے۔ (20)

سوال 2- آواز دوست میں قائد اعظم کے کردار کی کن خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے؟ تفصیل سے تحریر کیجیے۔ (20)

سوال 3- ''کشمیر اداس ہے'' اردو کے چند اہم رپورتاژوں میں سے ایک ہے! آپ کی کیا رائے ہے؟ (20)

سوال 4- غالب کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات تحریر کیجیے۔ (20)

سوال 5- غالب یا حالی کی غزلوں میں سے آپ اپنی پسند کے پانچ اشعار کی تشریح کیجیے۔ (20)

Downloaded From Tajassus.com

ANS 01

اردو کے ارکانِ خمسہ میں سے مولانا شبلی وہ منفرد مصنف ہیں جنہیں جامع العلوم کا لقب دیا جاسکتا ہے۔ وہ موضوعات کے تنوع کے بناء پر ”جامع الصفات اور جامع الجہات“ کہلانے کے مستحق ہیں۔ ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں انہوں نے اپنے سکہ نہ منوایا ہو۔ ”تاریخ ِادب اردو“ کے مصنف رام بابو سکسینہ نے سچ کہا ہے کہ:
اگر کوئی شخص ایک شاعر، فلسفی، مورخ، ناقد، ماہر تعلیم، معلم، واعظ ریفارمر، جریدہ نگار، فقیہہ، محدث سب کچھ ہوسکتا ہے تو وہ شبلی ہی کی ذات تھی۔ سرسید گروپ میں شبلی ہی وہ منفرد شخص ہیں جو انگریزی یا انگریزی ادب سے کماحقہ واقفیت کے باوجود معذرتی لہجہ اختیار نہیں کرتے۔ ان کی نظر اسلام کی عظمت رفتہ پر پڑتی ہے وہ تمام علوم کو مسلمانوں کی میراث سمجھتے تھے۔ اسلام، بانی اسلام یا مشاہیرِ اسلام پر کسی جانب سے اعتراض کئے جاتے تو پھر شبلی کا اسلوب اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ دنیا کے کسی حصے میں مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑی، شبلی کا قلم جولانیاں دکھانے لگا۔ معرکہ کانپور ہو یا جنگ طرابلس و بلقان وہ نظم میں، نثر میں انگریز کو لتاڑنے سے باز نہیں رہتے۔ ان کی نظموں میں ہی نہیں نثر میں بھی خطابیہ انداز ہے۔ سرسید گروپ کے ایک نامور رکن ہونے کے باوجود ان کا اسلوب اُن سب سے مختلف ہے۔ ان کی نثر میں ’’آزاد ‘‘کی طرح الفاظ کے طوطا مینا اڑانے کا رنگ نہیں جھلکتا۔ البتہ آزاد کا زورِ بیان اور قدرت کلام موجود ہے۔ شبلی کو بھی محاورہ بندی کا شوق ہے مگر ان کی عبارت محاوروں کی کثرت کی بناءپر نذیر احمد کی تحریر کی طرح انگشت نمائی کا موقع نہیں دیتی۔ ان کی تحریروں میں بھی حالی اور سرسید کی تحریروں کی طرح سادگی اور سنجیدگی موجود ہے۔ مگر یہ عالمانہ سادگی اور سنجیدگی ہے جس سے خاص و عام مرعوب ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ان عالمانہ سنجیدگی کے

باوجود شبلی کی تحریروں میں شاعرانہ لطافت اور حسن خیال کا ایک اچھا امتزاج بھی ملتا ہے-محققین نے سچ کہا ہےکہ: شبلی شاعرانہ دل اور فلسفیانہ دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے-

تصانیف

ان کی تصانیف میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، الماعون، الغزالی، الفاروق اور موازنہ انیس و دبیر- اس کی علاوہ فارسی اور اردو کلام کے مجموعے، مضامین اور مقالات کی کئی جلدیں اور دو ایک عربی تصانیف بھی ان کی یادگار ہیں-

شبلی کے طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیات ذیل میں درج ہیں-

(قوت اور جوش بیان(۱

شبلی کی تحریر کی سب سے نمایاں صفت قوت اور جوشِ بیان ہے جو ان کے احساس عظمت اور احساس کمال کی پیداوار ہے- وہ اپنے قاری کو ایک بلند سطح سے مخاطب کرتے ہیں- ان کے طریقۂ خطاب میں خود اعتمادی اور برتری کا احساس ہر جگہ نمایاں ہے- وہ علمی اور نسلی تفاخر کی بناءپر قاری کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں- انہیں زمانہ کی جہالت کا پورا پورا احساس ہے- وہ موقع کے لحاظ سے کسی جگہ خطیب بن کر، کہیں مدرس بن کر، کہیں واعظ بن کر اور کہیں فلسفی بن کر قاری سے مخاطب ہوتے ہیں - ان کی تحریر پڑھ کر قاری کی طبیعت میں ایک جوش اور ہیجان پیدا ہوجاتا ہے- ان کا اسلوب ان کے موضوع کا تابع ہے- ان کی تحریروں میں جوش اور ولولہ اپنے شباب پر نظر آتے ہیں- مثلاً سیرت النبی ﷺ کی ولادت کے موقع پر انہوں نے جو انداز تحریر اختیار کیا ہے اس سے نہ صرف شبلی کا دلی جوش اور ولولہ نظر آتا ہے بلکہ قاری کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوجاتی ہیں-

(۲)ایجازو اختصار

ایجاز و اختصار شبلی کی تحریروں کی دوسری بڑی خصوصیت ہے- ایجازو اختصار کو نظم و نثر دونوں کی خوبی سمجھا جاتا ہے- ایجاز و اختصار سے مراد یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو مختصر سے مختصر انداز میں اس طرح بیان کیا جائے کہ قاری کا ذہن بھی فوراً ا س کے مفہوم کو پاجائے- شبلی کو یہ فن آتا ہے ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ جہاں معانی پوشیدہ ہوتے ہیں جو کئی صفحات میں بھی نہیں سما سکتے- بیان کے اختصار کے لئے وہ شاعرانہ وسیلوں سے بھی کام لیتے ہیں- ان کی تحریروں میں تشبیہ کم تر استعمال ہوئی ہے اور استعارہ زیادہ، وہ آزاد کی طرح مرکب تشبیہات اور مرات النظیر کے سلسلوں میں کم الجھتے دکھائی دیتے ہیں اسی طرح حالی کی تحریروں کی طرح تمثیلوں کی بھی بھرمار میں بھی نہیں پڑتے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ ان کی تحریروں میں "استعارہ" جاری و ساری ہے-

Downloaded From Tajassus.com

(۳) مقصدیت

شبلی بامقصد ادیب ہیں۔ دبستانِ سرسید سے تعلق رکھنے والے ہر ادیب کی طرح ان کے لئے بھی مسلمانوں کی اصلاح بہت اہمیت رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنے لئے تاریخ کا میدان منتخب کیا۔ ہیروز آف اسلام پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ المامون ، سیرت النعمانؒ، الفاروقؓ اورسیرت انبی صلی اللہ علیہ وسلم(پہلی دو جلدیں) اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں اپنے مشاہیر کے متعلق پھیلی ہوئی غلط باتوں کو رد کردیا ۔ متعصب عیسائی مؤرخوں کی اعتراضات کے جوابات دئیے بلکہ ان کو مسلمانوں کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے بطورِ نمونہ پیش کیا اور مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی سے آگاہ کرکے حال میں ترقی کا راستہ دکھانا شبلی کا مطلوب و مقصود تھا۔

(۴)بے ساختگی

بے ساختگی سرسید' حالی اور شبلی کی تحریروں کا مشترکہ وصف ہے۔ مگر ہر ایک کی بے ساختگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سرسید کے ہاں یہ ہمیں بے ربط جملوں' عامیانہ محاوروں' پیچیدہ اور بھدی ترکیبوں کی صورت ملتی ہے۔ حالی کے ہاں یہ صفت سرسید سے اچھی حالت میں ہے۔ کیونکہ ان کی تحریریں سرسید سے زیادہ سلیس اور ہموار ہیں۔ مگر ان خوبیوں کے باوجود حالی کا ذاتی جوہر یعنی دھیما پن اسے ابھرنے نہیں دیتا۔ شبلی کی بے ساختگی ان دونوں سے الگ ہے۔ اس بے ساختگی میں کوئی عیب نہیں۔ اس میں سادگی ہے' چستی ہے روانی ہے اور تنوع ہے۔ وہ ہر بات بے ساختہ کہتے چلے جاتے ہیں۔ ایک لفظ بھی کہیں بلا ضرورت نظر نہیں آتا۔

(۵) تہذیبی احساس

شبلی کی تحریروں میں مشرق پرستی اور تہذیبی تفاخر کا احساس نمایاں جھلکتا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کی تہذیب کو برتر ثابت کرنے کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کردیں۔ ان کا دور مشرقی اور مغربی تہذیب میں شدید تصادم کا دور تھا۔ انگریزی تہذیب کی چمک دمک نے عام مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے عزت مآب لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کردیا تھا۔ وہ اپنے ماضی کا ذکر کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ وہ ہر بات میں"معذرت" چاہتے نظر آتے تھے۔ یہ شبلی ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کو احساس کمتری اور معذرتی لب و لہجے سے نجات دلائی۔ ماضی کے کارناموں کو سامنے رکھا۔ مغربی معترضوں کو مدلل جواب دیے۔ مغرب کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کہنے کی جرات دلائی' ذہنی طور پر ابوالکلام' ظفر علی خان وغیرہ شبلی کے ہی پیروکار ہیں۔

مرقع ادب کے مرتبین نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

Downloaded From Tajassus.com

ان کے یہاں بھی مولانا آزاد کا سا تہذیبی احساس ملتا ہے۔

(۶) تخیل کا عنصر

ان کی تحریروں میں تخیل کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے کہ دماغ فلسفیانہ اور دل شاعرانہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ بھی آزاد کی طرح چھوٹی چھوٹی حکایات اور علم و دانش سے بھرپور نکتے بیان کرکے عبارت میں رنگینی پیدا کردیتے ہیں۔ لیکن وہ محض تخیل کے اسیر بن کر نہیں رہ گئے ۔ انہوں نے فن کی خاطر مقصد کو قربان نہیں ہونے دیا۔ الغرض اردو ادب میں شبلی کو جو مقام ملا ہے اس کی بناءعلمی بھی ہے اور ادبی بھی۔ وہ نقاد، شاعر، مورخ، فلسفی، ماہرتعلیم، سوانح نگار سب کچھ ہیں مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا حسین اسلوب نگارش ہے۔

(۷) تنقید نگاری

شبلی کا اندازِ تنقید اگرچہ بڑی حد تک مشرقی ہے مگر انہوں نے جدید تنقیدی نظریات سے بھی روشنی حاصل کی ہے۔ اس طرح ان کی تنقیدوں میں جدید اور مشرقی اندازِ تنقید کے امتزاج سے ایک اور خاص توانائی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی تنقیدوں میں غیر جانبداری کے ساتھ ساتھ علمی، تحقیقی اور ادبی شان پائی جاتی ہے۔وہ جو بات بھی کہتے ہیں وہ بڑی مدلل اور واضح ہوتی ہے۔ مگر بعض مقامات پر وہ اس ڈگر سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ استدلال کے اعتبار سے وہ سرسید کے مانند ہیں اور اپنی تحریروں میں ادبی چاشنی پیدا کرنے کے لحاظ سے مولانا آزاد کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔

(۸) مورخانہ عظمت

اگرچہ اردو میں سیرت نگاری کی ابتداءحالی نے کی لیکن شبلی بھی اس میدان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ حالی نے صرف ان شخصیتوں کے سوانح حیات لکھے جن سے یا تو وہ ذاتی طور پر متاثر تھے یا جنہیں ہماری معاشرے میں مقبولیت حاصل تھی۔ مثلاً غالب، سرسید، سعدی۔ اس کے برعکس شبلی نے جن اکابر کی سوانح عمریاں لکھیں انہیں ہماری دینی، سیاسی اور ملی زندگی میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق رضہ (الفاروق)، امام غزالی رح (الغزالی)، امام ابو حنیفہ رح (سیرت نعمان) وغیرہ۔

(۹) ادبی لہجہ

شبلی کی تاریخی اور تنقیدی تحریروں میں بھی ادبی رچاؤپایا جاتا ہے۔ وہ خشک سے خشک موضوع اور ٹھوس علمی مسائل کو بھی شگفتہ ادبی زبان میں ادا کرتے ہیں۔قاری ان کی تحریریں پڑھ کر گویا ایک سحر میں کھوجاتا ہے۔اپنے مضمون ’’مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم ‘‘ میں تعلیم اور تعلم کا جو ادبی نقشہ کھینچا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

Downloaded From Tajassus.com

(۱۰) تحقیقی رنگ

شبلی کی تحریروں میں ایک خاص محققانہ شان پائی جاتی ہے۔ ان کی تصنیف سے ان کے عمیق مطالعے، تحقیقی اسلوب اور علمی بصیرت کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی تاریخی، تنقیدی اور ادبی تصانیف میں اپنی تحقیقی کاوش کا حق پوری طرح ادا کیا ہے۔

(۱۱) شاعرانہ اسلوب

شبلی اپنی نثر میں تاثیر کا عنصر پیدا کرنے کے لئے شاعرانہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ خوبصورت الفاظ، ہلکے پھلکے محاوروں اور حسین ترکیبیں ان کی نثر میں شگفتگی اور رعنائی پیدا کردیتی ہیں۔ تحریر میں ادبی حسن پیدا کرنے کے لئے بعض اوقات موزوں اشعار سے بھی کام لیتے ہیں۔

(۱۲) مبالغہ آرائی

شبلی بعض اوقات اپنے خطیبانہ آہنگ اور جذباتیت کی رو میں بہہ کر حقیقت بیانی سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ اس قسم کا ولولہ انگیز اندازِ تحریر قوم میں بیداری کی لہر دوڑانے کیلئے ہوسکتا ہے مگر مورخ کی شایانِ شان نہیں ہوتا۔

(۱۳) ناقدین کی آراء

ڈاکٹر حسین کے الفاظ میں:

شبلی ایک صاحب اسلوب نثر نگار ہیں۔ شبلی نے جو اسلوب اردو کو دیا وہ گوناگوں اوصاف کا حامل ہے۔ شبلی نے منطقی فکر کو شاعرانہ تخیل میں سمو کر ایک ایسا دلکش اسلوبِ بیان ایجاد کیا جس نے ان کی تحریر کے دائرہ اثر کو بہت وسیع کردیا۔ یہ اسلوب تخیل کے تاریک گوشوں پر عقل کی روشنی ڈالتا ہے۔ فکر کے بے رنگ خاکوں میں شعر کا رنگ بھرتا ہے اور جس طرح دوربین مکان کے فرق کو مٹادیتی ہے یہ زمانے کے فرق کو مٹا کر ماضی کو حال بنادیتے ہیں۔

بقول مہدی الافادی:

شبلی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا اور نکتہ آرائیوں سے ایک مستقل فن بنادیا۔

ڈاکٹر خورشید اسلام کا بیان ہے کہ:

شبلی پہلے یونانی ہیں جو ہندوستان مین پیدا ہوئے۔ وہ اگر انشاءپرداز نہ ہوتے تو مصور ہوتے۔

ANS 02

میناروں پر سیر حاصل بحث کے بعد وہ واپس مینار پاکستان کی طرف آتے ہیں اور اس کی بنیادوں کی مضبوطی کے لیے مشاورت کی بات سے موضوع کو آگے بڑھاتے ہیں اور قاری کو

Downloaded From Tajassus.com

پیچھے لے جاتے ہیں جب علی گڑھ کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔ وہ علی گڑھ کو مینار پاکستان سے مربوط کرتے ہیں کہ علی گڑھ کی بنیادوں کے ساتھ ہی مینار پاکستان کی بنیاد کا راستہ بھی طے ہونا شروع ہوا۔ واقعے کی پوری جزئیات نگاری سے سب واقعات باہم مربوط کرکے کڑیوں سے جوڑتے ہیں اور تین شخصیات کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں، سرسید احمد خان، علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح۔ کتاب کا یہ حصہ تاریخی روئداد پر مشتمل ہے جہاں مختلف مدارج ست تحریک کی بات کی گئی جس کے پہلے درجے میں علی گڑھ اور دوسرے میں تقسیم ہند کی قرارداد منظور ہوتی ہے۔ یہاں سے انقلاب کی کمان نوجوان نسل کے ہاتھوں میں آجاتی ہے جن میں اکثریت علی گڑھ کے فیض یافتہ ہیں۔

باد مخالف کی تندی کبھی کبھار ہمت پست کرنے کے بجائے اونچا اڑانے کے کام آجاتی ہے۔ اگلے صفحات میں مصنف اسی حقیقت کی عملی تفسیر بیان کرتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے مخالفین نے بھی اس کے بنیادوں کو پختگی فراہم کرنے میں مدد کی کہ اگر انگریز و ہندو اتنی شدید مخالفت نہ دکھاتے تو مسلمان بھی شاید اتنے شدید رد عمل کا مظاہرہ نہ کرپاتے۔ پاکستان کا نام اگرچہ اس وقت کے سیاسی ماحول میں موجود تھا لیکن باقاعدہ منتخب نہیں ہوا تھا، ایسے میں ہندوؤں نے ہی پہلی بار قرار داد لاہور کو قرار داد پاکستان کے نام سے موسوم کرکے ہندو پریس کے زریعے اچھالا جس پر مختار مسعود لکھتے ہیں :

"مینار پاکستان کی بنیادوں کو تحریک کے مخالفین سے بھی فیض پہنچا ہے۔ اکثریت کی بد اندیشی نے مسلمانوں کے لئے جو کنواں کھودا تھا وہی مینا ر کی بنیاد کے کام آیا۔"

ہندووں کی مخالفتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ عالمانہ مگر شائستہ طنز کرتے ہیں۔ گاندھی جی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے حوالے سے اپریل 1947 کو خبر چھپی کہ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ:

"میں اب تک پاکستان کا مطلب نہیں سمجھا"

مصنف یہاں ازراہ تفنن رقم کرتے ہیں کہ:

"کسی نے جواب دیا زرا چند ہفتے توقف کریں تو مطلب نقشے پر عیاں ہو جائے گا"

مسلمانوں کی طرف سے مخالفت کا ذکر بھی وہ مینار پر چڑھتے ہوئے عالمانہ طنز اور تشبیہات سے کرتے ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ہر واقعے کے کئی پہلو ہوسکتے ہیں اور ممکن ہے جس پہلو سے ایک انسان کو کوئی چیز نظر آئے دوسرے پہلو سے نظر نہ آئے۔ ایسے میں مصنف کا طنزیہ لہجہ قاری کو جانبداری کا احساس دلاتا ہے حالانکہ اس وقت کے علماء کی رائے حالات و واقعات کے مطابق تھی جس سے اختلاف رائے کیا جاسکتا تھا لیکن

Downloaded From TajaSsus.com

مصنف قائد اعظم سے عقیدت میں ان سے ہر اختلاف رائے رکھنے والے کو دشمن متصور کیے ہوئے ہیں، لکھتے ہیں :

"ایک ساتھی نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دو چار پرندے دیکھ لیے، کہنے لگے یہ کیا ہے، عرض کیا یہ پرندہ ہر مینار پر بسیرا کرتا ہے- انہیں دن میں کچھ نظر نہیں آتا اور ویسے بھی الٹا لٹکا ہونے کی وجہ سے انہیں ہر چیز الٹی نظر آتی ہے- ساتھی کہنے لگے، ان کا قصہ چھوڑو یہ بتاؤ کہ خود مسلمانوں نے اس تحریک کی کتنی مخالفت کی تھی- میں نے کہا، یہ مخالفت کا تیسرا رخ تھا- مندر اور کلیسا کے بعد- کچھ مخالفت ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں سے بھی ہوئی- ایک قوم پرست مسلمان وزیر اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو جتنا ایمان گاندھی پر تھا اگر اسی قدر اللہ پر ہوتا تو ولی اللہ ہوتے- علماء کا ایک قافلہ بھی راہ میں بھٹک گیا تھا- "

صاحب کتاب کا شاعرانہ تخیل تاریخی واقعات کو اتنا خوش شکل کرکے پیش کرتا ہے کہ قاری حال سے مستقبل میں جینے لگ جاتا ہے اور واقعات میں چھپے حقائق تک پہنچنے میں مصنف کے زیرسایہ قریب ہوجاتا ہے- اگرچہ مختار مسعود کے بقول مینار پاکستان کا یہ مضمون طویل مختصر ہے لیکن درحقیقت یہ بھی کافی طویل ہے جس کی طوالت داستانی شکل نے گراں بار نہیں ہونے دی ہے- آخر تک دلچسپی برقرار رکھنے اور قاری کو مضمون کے ساتھ جڑے رکھنے کے لیے مصنف کئی تکنیک کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں- بنیادی طور پر تین اہم اجزاء کے گرد یہ ڈرامائی تیکنیک گھومتی ہے- پہلے جزء میں اس اجلاس سے شروعات کرتے ہیں جو مجلس تعمیر کی ہے- اس سے منظر تبدیل کرکے میناروں کے سفر پر قاری کو لے جاتے ہیں اور دنیا کے تقریبا سب اہم اور غیر اہم میناروں کی سیاحت کرتے ہیں- اس کے بعد دوسرے جزء کی طرف بڑھتے ہیں جس میں اس عظیم الشان جلسے کا ذکر ہے جو 23 مارچ 1940 کو ہوا- یہ ذکر روایتی تاریخ دانی کی طرح نہیں بلکہ واقعات کے موثر بیان سے اس جزء کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے- مہاجرین کا ذکر، مینار پاکستان کی تعمیر کا سلسلہ اس کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور کہانی آگے بڑھ کر تیسرے پڑاؤ میں آجاتی ہے- یہاں پر قائد اعظم اور دوسری نمایاں شخصیات قیام پاکستان کے خواب کو تعبیر کرنے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں- تحریک پاکستان اور قیام کی کہانی کو پیش کرنے کا یہ انداز اچھوتا ہے جس کے مختلف اجزاء کا آپس میں ربط قائم کرنا کٹھن ہے لیکن مختار مسعود نے ماہرانہ فنکاری اس ربط کو برقرار رکھتے ہوئے قاری کی فکر کو جھنجھوڑ کر اس مضمون کا اختتام کیا ہے-

قحط الرجال:

آواز دوست کا دوسرا مضمون "قحط الرجال" ہے جو طویل تر ہے- اس پر اردو ادب کے مختلف اصناف کی تعریف صادق آتی ہے کہ یہ خاکہ نگاری، تاریخی سفر نامہ، رپورتاژ یا آٹوگراف البم

Downloaded From Tajassus.com

کی کی کہانی کے صفات پر پورا اترتا ہے۔ مضمون کی تصنیف سقوط مشرقی پاکستان کے دنوں کی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سقوط بغداد کے بعد یہ ملت اسلامیہ کے لیے دوسرا بڑا سانحہ ہے۔ اس ابتلائی دور میں کہ جب ہر نفس حواس باختہ و پریشان، نا امید و مایوس تھا ہر طرف بڑے آدمیوں کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ ایسے میں مختار مسعود نے نابغۂ روزگار ہستیوں کا ذکر چھیڑ کر محفل عبرت بپا کی اور اس تشنگی کے احساس کو مزید بڑھاوا دیا۔ مضمون کا ابتدائیہ جو مصنف کی پہچان بن گیا تھا انتہائی متاثر کن، حیرت انگیز اور گہرائی و معنویت کی ایک دنیا لیے ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"قحط میں موت ارزاں ہوتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی۔ مرگ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیات بے مصرف کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ اس وبا میں آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ مردم شماری ہو تو بے شمار، مردم شناسی ہو تو نایاب۔"

عظیم لوگوں کی کمی کا احساس مصنف کو شدت سے ہے اور وہ اس میں اپنے قاری کو بھی شامل کردیتا ہے۔ آٹوگراف البم اٹھائے وہ بڑے آدمیوں کی تلاش میں سرگرداں ہے اور قاری بھی یہ جاننے کے لیے بے چین ہے کہ ان کی نگاہ انتخاب اب کس پر ٹھہر کر کیسی خوبصورتی سے وہ بیان کرتی ہے۔ رجال کار کی ناپیدی کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ آٹوگراف البم کی کہانی اس وقت شروع ہوئی جب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور ایک دن ایک چینی مسلمان عالم ہمارے گھر چائے پر مدعو ہوئے۔ والد محترم نے ان سے ملنے اور آٹوگراف لینے کا حکم صادر فرمادیا تو ان سب باتوں اور آداب سے ناآشنائیت کے باوجود البم خرید کر لایا اور ان سے آٹوگراف لیا۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ سطریں اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں لیکن حیرت تب دور ہوئی جب پتہ چلا ہر اچھی بات الہامی ہوتی ہے اور ہر الہام ناشل ہوتا ہے۔

چینی عالم سے دستخط لینے لینے کے بعد اب نیا مرحلہ مزید بڑے لوگوں سے آٹوگراف لینے کا تھا لیکن بڑے آدمی کون ہیں اور کن کے اقوال سے اس البم کے صفحات بھرے جائیں۔ یہاں پر مختار مسعود اپنے والد سے مشورے کے طلب گار ہوئے تو انہوں نے ایک مختصر مگر جامع اصول بتلادیا کہ:

"آٹوگراف البم کے صفحات ہوں یا زندگی کا ورق سادہ، انہیں یونہی نہیں بھرنا چاہیے۔ جاؤ نگہ انتخاب کو کام میں لاؤ، بڑے آدمی زندگی میں کم کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔ "

نصیحت صاحب کتاب نے گرہ باندھ لی اور ساری زندگی نگہ انتخاب کو کام میں لاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی البم کے اکثر صفحات خالی رہ گئے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اصولوں پر سمجھوتے کے قائل دکھائی نہیں دیتے اور نہ ہی وقتی پسندیدگی البم تک لوگوں کے قلم کو دسترس دیتی ہے۔ ہر پیمانے سے تول کر، ہر طرح سے دیکھ کر وہ آٹوگراف لیتے ہیں۔ عظیم

Downloaded From Tajassus.com

لوگوں کی دریافت کے لیے وہ کتابوں میں انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ بچوں کی کہانیوں میں اسے ولندیزی بہادر بچے کی داستان ملتی ہے۔ جرأت اور بہادری سے جو قوم کو غرق آب ہونے سے بچا لیتا ہے تب وہ آگے اس راز سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ بڑے آدمی کون ہیں :

"ان میں سے ہر شخص نے دنیا کو جس حال میں پایا اس سے بہتر حال میں چھوڑا اور یہی بات انہیں عام آدمی سے ممتاز کرتی ہے۔ "

بچوں کی کہانیوں سے لڑکوں کی کتابوں تک سفر کے اس روئداد میں وہ جگہ جگہ ادب کے موتی بکھیرتے، علمیت کے خزانے لٹاتے نظر آتے ہیں۔ عظیم لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں، اہل شہادت، اہل احسان اور اہل جمال۔ اہل شہادت کی خاصیت حکمت ملنے پر جنوں گردانتے ہیں، اہل احسان کی خیر کثیر اور اہل جمال کی حسن۔ زندگی کے امکان کو ایک گروہ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، توانائی دوسرے اور تابندگی تیسرے گروہ کے ساتھ۔ ان میں امتیاز کے لیے رقم طراز ہیں :

"بچوں کی کہانیوں سے مجھے جرأت اور قربانی کا نشان ملا اور لڑکوں کی کتابوں سے مجھے حکمت اور خدمت کا پتہ چلا۔ پہلے گروہ کے لوگ شہید کہلاتے ہیں اور اس دوسرے گروہ میں جو لوگ شامل ہیں انہیں محسنین کہا جاتا ہے۔ اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی، ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے اس توانا وجود کو توانائی ملتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہوتا ہے جو اس توانا وجود کو تابندگی بخشتا ہے، جو لوگ اس آخری گروہ میں شامل ہوتے ہیں وہ اہل جمال کہلاتے ہیں۔ "

عظیم لوگوں کی ناپیدی پر شکوہ کناں مصنف اگلے صفحات میں عظیم لوگوں کی خوبیاں گنواتے ہیں اور 1870 کی دہائی کو عظیم لوگوں کی پیدائش کو دور قرار دیتے ہیں۔ یورپ میں چرچل، لینن، سٹالن اور برصغیر میں قائد اعظم، علامہ اقبال، محمد علی جوہر، ظفر علی خان کا ذکر کرتے ہیں کے 1920 سے 1945 تک ربع صدی میں دنیا کا ہر بڑا کام ان کے بغیر نہ چل سکتا تھا لیکن اب ان جیسے لوگ پیدا ہونے ہی بند ہوگئے۔ بیسیویں صدی کے ابتدائی بیس سالوں میں پیدا ہونے والی کھیپ سے توقعات رکھتے ہیں لیکن جب وہ بار آور نہیں ہوتیں تو کیا ہی تاریخی الفاظ میں ان کا ماتم کرتے ہیں کہ:

"شاید ان بیس سالوں میں مائیں صرف افسر اور تاجر ہی جنتی رہیں۔ ممکن ہے قدرت اس فیاضی کا جو اس نے انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں دکھائی تھی حساب لے رہی ہے، جو ملک اور قومیں اس میزان پر پوری اتریں انہیں مزید بڑے آدمی عطاء ہوئے اور جو ناکام رہیں انہیں سزا کے طور پر ایسے لوگ ملے جو شامت اعمال ہوا کرتے ہیں۔ "

Downloaded From Tajassus.com

آٹوگراف البم کے صفحات کو جن کا قلم زیر کر پایا ان میں محمد ابراہیم شاکیو چن (چینی مہمان)، نواب بہادر یار جنگ، ای ایم فاسٹر (انگریزی ناول نگار)، ملاواحدی، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، سید عطا اللہ شاہ بخاری، نواب حمید اللہ، راجہ صاحب محمود آباد، سروجنی نائیڈو، ارنلڈ جے ٹائن لی اور قائداعظم محمد علی جناح کے نام اس فہرست میں نمایاں ہیں۔ قحط الرجال مختصر شخصی خاکوں سے مزین ایسا مضمون ہے جس میں فن اور فکر کی اڑان اونچائیوں پر ہے۔ ہر خاکے کے اختتامی کلمات میں آنے والی شخصیت کا مختصر تعارف کیا جاتا ہے جو کے ربط باہم کا کام کرتا ہے۔ قحط الرجال کے تمام خاکوں میں شخصیات کے ساتھ مصنف اپنی ذہنی و جذباتی وابستگی کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ مثلا مولانا آزاد کو بڑا ماننے کے باوجود بھی ان کے ساتھ ایک نفرت کا لطیف احساس رکھتے ہیں، حسرت موہانی کے ساتھ طرز زندگی، بہادر یار جنگ کے ساتھ تحریک اور قائد اعظم کے ساتھ سر تا پا محبت کا احساس موجزن ہے۔ الغرض کردار نگاری کے جملہ محاسب اور جزئیات نگاری کی تمام باریکیاں قحط الرجال میں اوج پر نظر آتی ہیں۔

قحط الرجال میں ابراہیم شاکیو چن کے بعد بہادر یار جنگ کا احوال ہے۔ اس کی بے مثال خطابت کے مصنف اسیر نظر آتے ہیں اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واری ہو رہے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں سیرت کے عنوان پر ان کی پہلی تقریر اسکول میں سنی اور دل میں بسا لیا۔ تفسیر قرآن، سیرت نبوی اور کلام اقبال کو ان کی فکر کی وسعت کا زریعہ گردانتے ہیں، خصوصا سیرت نبوی کو ان کی سیاسی بصیرت کا ماخذ سمجھتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"بہادر یار جنگ کی سیاسی بصیرت کا یہ حال تھا کہ جس رائے کا برملا اظہار کیا وہ صحیح نکلی اور جس خطرے کی علی الاعلان نشاندہی کی وہ درست ثابت ہوا۔ "

مصنف کی بات کو تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ قریبا صدی قبل بہادر یار جنگ نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا اور مصنف نے جنہیں نصف صدی قبل قلم بند کی تھا وہ علی کل مصداق آج حرف بہ حرف پورے نظر آتے ہیں۔ بہادر یار جنگ ایک موقع پر قائد اعظم کو مخاطب کرکے کہتے ہیں جس کو مصنف نے ان الفاظ کے ساتھ سپرد قرطاس کیا ہے کہ:

"قائد اعظم کے سامنے ایک بار یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان کا حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا پاکستان کو پاکستان بنانا مشکل ہوگا۔ "

اس خاکے کا اختتام وہ بہت جذباتی انداز میں کرتے ہیں جب ان کے دوست اور وہ مل کر ان کی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر 26 دسمبر 1943 کو کی گئی تقریر کا تجزیہ کرتے ہیں تاکہ ماضی سے اتفاق کی راہ نکلے۔ دونوں اس فیصلے پر پہنچتے ہیں کہ نواب بہادر

Downloaded From Tajassus.com

یار جنگ ایک عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان، گفتار میں فرد اور کردار میں مرد تھے جس کے صحیح مقام اور منزل کو ہم نہ پہچان سکے۔

اگلا خاکہ انگلستان کے مشہور ادیب ایم-وی-فاسٹر کا ہے جس کے ابتدائیے میں نواب بہادر یار جنگ کی شعلہ بیانی کے بعد اس انگریز ناول نگار کے ٹھہراؤ سے متاثر ہونے کا ذکر ہے۔ جون 1978 کی سہہ پہر میں ریڈیو پاکستان کی ایک مختصر خبر جس میں فاسٹر کے موت کی خبر تھی سے بات آگے بڑھاتے ہیں اور آٹوگراف البم میں موجود ان کے دستخط کا تجزیہ کرتے ہیں۔ فاسٹر کی خدا ترسی اور مسلم پسندی کو ان کا سرمایہ گردانتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اسے مسجد میں اسلام کی سادگی اور سلامتی کا پیغام بھی ملا اور خود فراموشی اور خدا شناسی کا مقام بھی، خانۂ خدا نے اس کے دل میں گھر کرلیا۔ "

فاسٹر کے ناول نگاری پر بات کرتے ہوئے خوبصورت چھوٹے چھوٹے فقروں سے قارئین کو جکڑ لیتے ہیں۔ ان کی نفسیات دانی کی مہارت اس خاکے میں عروج پر نظر آتی ہے اور اس وقت کی انگریز غلامانہ ذہنیت کے تار و پود بکھیرنے لگتے ہیں۔ اس کے ایک ناول کا تجزیہ کرتے ہوئے دنیا جہان کی تاریخ کا احاطے کرتے ہوئے اختتامیہ میں لکھتے ہیں :

"میں نے ناول ختم کیا تو یوں لگا گویا یہ کسی صوفی فلسفی اور عاشق کی لکھی ہوئی مثنوی ہے، محض ادیب اور ناول نگار ان بلندیوں تک کہاں پہنچتا ہے۔ "

فاسٹر کے در سے ہوتے ہوئے مصنف ایک اور خاکے کی طرف نکل پڑتے ہیں جو اپنے پیش رو خاکوں سے نسبتا طویل ہے اور ملا واحدی سے مختار مسعود کی محبت کا بین ثبوت ہے۔ ان کے تین خصوصیات، عبارت، ادارت اور رفاقت مصنف کے زیر نظر ہیں اور نپے تلے فقرات کے دریا سے فصاحت کے سمندر میں قاری کو غرقاب کرتے ہوئے قرطاس پر قرطاس بھرتے جارہے ہیں۔ خاکے کے ذیل میں ملا واحدی کے پیر و یار خواجہ حسن نظامی کا تذکرہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ نوائے وقت میں ایک کالم سے ملا واحدی کو جاننے سے ملنے کے سفر کی یہ داستان مفرس و معرب ہے۔ ان کے طرز تحریر کی خوبصورتی کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مغلیہ تہذیب کی وراثت، خاندانی شرافت کا سرمایہ، مرشد کی خاص عنایت، مشاہیر ہر وقت تعلق، لکھنے پڑھنے کا شوق اور کاروبار، محنت کی عادت، معاملگی کی دیانت، عہد کا پاس، عروس البلاد سے وابستگی، دین کا ذوق، حضور کی محبت اور خدائے بزرگ و برتر کے فضل و کرم پر ایمان کام حاصل ہو تو لکھنے والے کی ذات تحریر کے ہر لفظ اور فکر کے ہر انداز میں جھلکتی ہے۔ ساری عمر ایک خاص ڈھب سے بسر ہو تو سوچ کا یہ ہمی گیر مگر پختہ اور یکساں انداز نصیب ہوتا ہے۔ "

Downloaded From Tajassus.com

بات ان کے جملہ محاسن سے ہوتے ہوئے نکلتی ہے اور کراچی کے حالات پر آجاتی ہے۔ مصنف کے عمیق مشاہدے کی قوت یہاں صاف نظر نے لگتی ہے اور کڑی سے کڑی جوڑتے ہوئے موسم کے اعتدال سے اڑان بھرتے انسانی مزاج کے تلون پر تان ٹوٹتی ہے۔ مفتی کفایت اللہ کا تذکرہ زیر قلم کرتے ہوئے دیوبند کی طرف نکلتے ہیں اور علی گڑھ کے ساتھ اس کی قربت و دوری کے واقعات بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔

کراچی، دیوبند اور علی گڑھ کے بعد دلی کی باری آتی ہے تو تاریخ کے در وا ہونے لگ جاتے ہیں۔ پرانی دلی سے ہوتے ہوئے بات اس کے صنعتکاروں کی طرف جا نکلتی ہے اور مدن موہن پر پہنچ جاتی ہے جن کے ساتھ مصنف کی بچپن کی شناسائی ہے۔ صنعتوں پر سیر حاصل گفتگو کے بعد وہ واپس اپنے موضوع ملا واحدی کی طرف آتے ہیں اور ان کے خاندان کی شرافت کو قارئین کی بصارتوں کی نظر کرتے ایک بہت ہی خوبصورت تمہید کے ساتھ اس خاکے کا اختتام کردیتے ہیں۔

ملا واحدی کی نصیحت "بولنے'لکھنے اور ہر کام کرنے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس سے دین یا دنیا کا کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں " کا مصداق ڈھونڈتے ایک ایسے شاعر کے در پر رکتے ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گزرا۔ انقلاب کی راہ میں اپنا گھر بار، مال و دولت، قلمی نسخے، کتب خانہ اور جوانی لٹانے والے کے عزم و ہمت سے متاثر نظر آتے ہیں کہ اس شخص نے فرنگ کے دبدبے کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دی۔ یہاں تک کہ دوران قید ان کا لخت جگر بیمار ہوا، جیل والوں نے کوئی اطلاع نہ اور جب ان کا انتقال ہوا تب بھی حاکمان جیل خاموش رہے۔ بلائیں تمام ہوگئیں تو اس باکمال شاعر نے کہا:

جو چاہے سزا دے لو، تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو، کی ہو جو شکایت بھی

حسرت موہانی، مصنف کے لیے آٹوگراف کا انتخاب بن گئے کہ جنگ آزادی میں یہ شاعر ہر محاذ پر پہلی صفوں میں ملتا ہے۔ مصنف کو ان کی مجموعہ اضداد زندگی پسند آتی ہے۔ خاکے میں اسی سے رنگ بھرتے جاتے ہیں اور آخر میں قارئین کو پتہ چلتا ہے کہ مصنف سے ان کا تعارف ریڈیو پر چلنے والی ایک غزل کے ذریعے ہوا، ان دیکھے کی چاہت دیکھنے اور ملنے پر منتج ہوتی ہے۔ حسرت کا یہ خاکہ طویل مگر دلچسپی سے بھرپور ہے کہ مصنف نے شعر و سخن کے میدان کو بھی بحث میں سمو دیا ہے اور قاری سے داد لیتا ہے۔ اختتامیہ میں دستخط کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"فقیر حسرت موہانی 2 دسمبر 1943ء- فقیر کے نقطے نہیں اور موہانی تو صرف شوشے دار نصف دائرہ اور ایک ٹیڑھی لکیر ہے۔ نقطے نہ سہی، وہ شخص نکتہ سنج تو تھا۔ لکیر سیدھی نہ

Downloaded From Tajassus.com

سہی، وہ خود تو ساری عمر صراط مستقیم پر چلتا رہا۔ دستخط بد خط سہی، وہ شاعر خوش نوا تو تھا۔ "

اگلا خاکہ حسرت موہانی کے ایک ہم عصر شاعر و ادیب کا ہے جو حسرت ہی کی طرح گرفتار بلا رہے۔ صحافت، خطابت اور بغاوت کی وجہ سے ناموری پانے والے مولانا ظفر علی خان مصنف کا آٹوگراف کے لیے اگلا انتخاب ہیں۔ ان کے ذکر کے ساتھ ان ہی کے ہم عصر مولانا محمد علی جوہر کا ذکر چلتا ہے، علی گڑھ کی بات ہوتی ہے اور اخبارات پر ٹھہرتی ہے۔ ظفر علی خان کے کلام کا تجزیہ ہوتا ہے اور بات آگے بڑھتی ہے۔ بالاخر مصنف علی گڑھ ہی میں منعقدہ ایک جلسے کے اختتام پر موصوف سے آٹوگراف حاصل کرلیتے ہیں اور اس طویل خاکے کو ختم کرتے ہیں۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں قحط الرجال نہیں تھا بلکہ رجال کار کی فراوانی تھی۔ کوئی تحریر میں یکتا تو کوئی تقریر میں بے بدل، ایسے ہی ایک خطیب بے مثال مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا خاکہ اگلے حصے میں قرطاس کی زینت بنتا ہے۔ احراریوں سے اختلاف کے باجود ان کے سرکردہ سے مصنف مرعوب نظر آتے ہیں۔ اپنے پیشے کی مجبوری تقریر سننے میں آڑے آتی ہے تو شاہ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور کچھ بحث و تمحیص کے بعد شاہ صاحب مصنف کے دولت کدہ کو رونق بخشتے ہیں۔ خاکے میں بنیادی رنگ اسی ملاقات کی روئداد ہے مگر تذکرہ مشاہیر بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ان سے چند سوالات کے ساتھ مجلس ملاقات ختم ہوتی ہے اور خاکہ بھی اختتام پذیر ہوجاتا ہے۔ ان کی خطابت کے بارے میں لکھتے ہیں :

"وہ خطابت کس پائے کی ہوگی جسے مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد اور بہادر یار جنگ کا زمانہ ملا پھر بھی سب پر بھاری رہی۔ "

جاپانیوں کی باغبانی سے اگلے خاکے کا ابتدائیہ لکھتے ہیں۔ امریکہ، جاپان، جمہوریت اور باغبانی سے ہوتے ہوئے بات نوابوں کے عادات و خصائل پر ٹھہرتی ہے۔ ذکر اگلے آٹوگراف کا چھڑتا ہے اور نام نواب حمید اللہ خان کا آتا ہے۔ ان کی سادہ مزاجی اور نفاست کے حسین امتزاج کو بیان کرتے ہوئے خاکے کو دعائیہ اختتام دیتے ہیں۔

نوابوں کے بعد راجاؤں کا ذکر آتا ہے تو ایک ایسے راجہ کا ذکر ملتا ہے جو بقول مصنف جاگیر بھارت میں چھوڑ آئے، سیاست پاکستان آکر ترک کردی، ہوشمندی ہنوز ان کے ساتھ ہے مگر دردمندی کا پتہ نہیں ملتا۔ خاکہ راجہ آف محمودآباد کا ہے جو بظاہر بانکے نظر آتے ہیں لیکن جوشیلی تقریر سے مصنف کا دل موہ لیتے ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے تو راجہ صاحب کی پاکستان میں خاموش مزاجی موضوع بن جاتی ہے کہ تحریک پاکستان میں پرجوش راجہ

Downloaded From Tajasus.com

پاکستان بننے کے بعد یکایک کیوں گمنامی کی زندگی کو ترجیح دینے لگے۔ مصنف ان کی تبدیلی کا راز جاننے اس سے ملاقات کی طلب رکھتے ہیں جو بالاخر اگست 1970 کو پوری ہوجاتی ہے۔ اس ملاقات میں کچھ ایسے انکشافات ہیں جو قارئین کو جھنجھوڑ ڈالتے ہیں۔ مثلا قائد اعظم کی بیماری، پاکستان کے اصل نقشے کے بجائے کٹے پھٹے حدود اربعہ پر اکتفاء اور مسلم لیگ کی نا اہلی۔ راجہ صاحب کے زبان میں مسلم لیگ نے پاکستان نہیں بنایا، مسلم لیگ کہاں اتنی منظم تھی کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتی۔

قاری کو سوچتا چھوڑ کر اگلے خاکے میں اپنے البم کے اکثر خالی صفحات کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ ایک سیاہ بلی کے واقعے سے قارئین کو اپنی کیفیت سمجھاتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد سے اپنے ناپسندیدگی اور پسند کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی تقریروں اور بیانات کا تجزیہ کرتے ہوئے تلخی کو قاری محسوس کرتا ہے اور جانبداری کی طرف دھیان جانے لگتا ہے۔ انگریزوں سے ملکہ ایلزبتھ کی داستان پر آتے ہیں اور وہاں سے چین کا ذکر، انقلاب چین کا احوال اور ماؤزے تنگ سے آٹوگراف لینے کی خواہش کے ساتھ مختلف لوگوں کے تذکرے چلتے ہیں۔ یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کا تذکرہ ہے، اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری اوتھانٹ سے اول وہلت میں کدورت اور بالاخر ایک واقعہ سے متاثر ہونے کا ذکر ہے اور آخر میں اپنے ہی ایک آٹوگراف کی روئیداد ہو جو ایک بظاہر ماڈرن نظر آنے والی لڑکی کو دیا۔

آخری تین خاکے بہت طویل ہیں اور مصنف کی قلبی رغبت کو ظاہر کرتے ہیں، پہلا سروجنی نائیڈو کا ہے اور آخری قائد اعظم محمد علی جناح کا۔ اس خاکے میں ادبیت، خوبصورت تلمیحات اور استعارات نیز شاعرانہ بانکپن عروج پر ہے، ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے:

"کعبۂ دل میں جھانکا تو دیکھا کہ ایک صنم نے وہاں گھر کرلیا ہے۔ ہمیں گمان تھا کہ دور آزری ختم ہوئے مدت بیت چکی ہے اور اس عرصہ میں دل اگر صحن مسجد نہیں بن سکا تو کیا غم کم از کم بتکدہ تو نہیں رہا۔"

سروجنی کا مسلمانوں سے تعلق، تقریر پر گرفت، علی گڑھ آمد اور یونین ہال میں جلسے سے خطاب کو مصنف انتہائی والہانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں کہ ایک بار ان کی والدہ نے کہا:

"کون ہے یہ کافرہ کہ جب جوان تھی تو باپ گرویدہ تھا اور بوڑھی ہوئی تو بیٹا شیدا ہے۔ "

پورا خاکہ سروجنی کے سر و قامت سے ہوتا ہوا ان کی مسلم یونیورسٹی آمد کے پس و پیشت گھومتا ہے۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی پر تفکرات اور بے یقینی کے سائے چھائے تھے۔ بقول مصنف ہر شخص اس حقیقت سے واقف تھا کہ ایک منزل سر ہوچکی ہے اور اب کتنے ہی بے گناہ سر اس کی پاداش میں کٹ جائیں گے۔ تعجب اس بات پر تھا کہ یہ قربانی اس وقت

Downloaded From Tajassus.com

طلب ہوئی جب ہم منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ایسے میں سروجنی کی تقریب میں شرکت سے ماحول تھوڑا امید افزا ضرور ہوا مگر جب اس نے تقریر کا پہلا جملہ کہا تو ماحول پر سکوت چھا گیا، اس کے ساتھ آنے والے گنگ رہ گئے اور اس نے ببانگ دہل اپنی حمایت اور شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا عزم دھرایا۔ ان کی تقریر کے جزئیات پر مصنف خاکے کو آگے بڑھاتے ہیں، تقریر کے عناصر ترکیبی پر بات کرتے ہیں اور سروجنی کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ پروفیسر ہادی حسن کا تذکرہ درمیان میں آتا ہے کہ کس طرح وہ ان کے سامنے تقریر میں توقعات پر پورا نہ اترسکے۔ پروفیسر صاحب کی زندگی اور اس کے ساتھ گزرے لمحات سے قارئین کو آگاہی دینے کے بعد موصوفہ سے اپنے پہلے تعارف کا واقعہ بتلاتے ہیں۔ پہلا جلسہ اور اس میں ایک لڑکے کا سروجنی کے لیے خیرمقدمی تقریر کی تمہید کا ذکر ہے جس کو مصنف نے ترجمہ کرکے کچھ یوں لکھا ہے:

"اس خوشرنگ اور روشن شخصیت کے استقبال کے لیے حاضر تو ہوگیا ہوں مگر سوچتا ہوں شروع کہاں سے کروں، اس خطابت سے جسے کوئی نہ پہنچ سکا یا اس محبت سے جو ہر ایک کے حصے میں آئی۔ "

شاعری کی تمام تشبیہات سے مزین اس خاکے میں جزئیات نگاری بھی حدوں پر ہے۔ سروجنی کے نشست پر بیٹھنے کے انداز سے لے کر تقریر کے لیے آنے تک، تقریر کے جملوں میں احساسات کے اتار چڑھاؤ سے لے کر تاثرات کے اظہار تک سب کا عمیق جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف ان کی تقریر کے حد درجہ اسیر نظر آتے ہیں کہ بار بار دو چار پیرائیوں کے بعد مختلف استعارات سے ان کی تقریر کو بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔ سروجنی سے آٹوگراف لینے کا واقعہ اور اس کے سامنے کی گئی خود کی تقریر کا بڑے مزے سے ذکر کرتے ہیں اور اس کی اسلام پسندی پر آنکلتے ہیں۔ خواتین سے ان کی کی گئی تقریروں میں سے اسلام کے حوالہ جات نقل کرتے ہیں اور اس دورانیے میں کی گئی سب اہم تقریروں کے خلاصے پیش کرتے ہیں۔ ہندو مسلم تعلقات پر سروجنی کا حوالہ دیتے ہیں اور ان تعلقات کی تاریخی حیثیت کو زیر قرطاس لا کر سروجنی کو ایک خواب سے تشبیہ دے کر خاکے کا اختتام کرتے ہیں۔

یہ خاکہ سب سے طویل ہے، ابتدائیہ میں 1857 سے شروع ہوئے اس سفر کو 1947 تک لا پہنچاتے ہیں اور ابتدائیہ میں ہی قیام پاکستان کے ساتھ متصل 1958 اور 1971 کا ذکر ہے کہ جس ملک کے لیے اتنی طویل تحریک چلی وہ محض چند سالوں میں ہی حکمرانوں کی غفلت سے دو لخت ہوگیا۔ یہاں اسلام اور مسلمانوں کی زندگی پر فلسفیانہ انداز سے قارئین کو ان اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہیں جس میں اقوام کی بقا پوشیدہ ہے۔ تہذیبوں کا عروج اور تاریخ انسانی کے جائزے سے بات ہوتے ٹائن بی تک آپہنچتی ہے اور ان کے اقوال اور مشاہدات،

Downloaded From Tajassus.com

زندگی اور طرز زندگی سے آگے بڑھتی ہے۔ ٹائن بی کے نظریات کا تقابل ہوتا ہے، نظریہ مجاہدہ کا تجزیہ کرتے ہیں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی وجوہات قاری کے سامنے لے آتے ہیں۔ اس خاکے میں مصنف تاریخ کا ایک ایسا عالم نظر آتا ہے جس کو ہر تہذیب اور ادوار سے آگاہی ہے اور وہ اس آگہی میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔ زوال کی صورتوں پر بحث سے بات آگے بڑھتی ہے، پہلی سے چھٹی صورت تک ہر ایک کا تجزیہ ہے، محاکمہ ہے اور اس کے بعد ٹائن بی کی تاریخ دانی کے تذکرے کی طرف ورود ہے۔ یہ خاکہ ان تین طویل خاکوں میں شامل ہے جن شخصیات سے مصنف از حد متاثر نظر آتے ہیں۔ متاثر ہونے کی وجوہات کی طرف آگے چل کر خود اشارہ دیتے ہیں کہ:

"تین آیات کے حوالے سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ ٹائن بی کی فکر قرآن مجید سے کس قدر قریب اور متاثر ہے۔ "

ٹائن بی کی تصنیفات اور مصروفیات کا ذکر ہے کہ شدید مصروف حکومتی مشاغل کے باوجود اس کا مطالعہ قابل رشک ہے۔ گزرے ہوئے زمانوں کے بے نشان باشندوں سے دوستی نبھانے کی خاطر وہ راتوں کو جاگ جاگ کر یہ کام سر انجام دیتے رہے اور مصنف سے داد ان حروف میں لی کہ بیدار مغز لوگ راتوں کو بھی بیدار رہتے ہیں۔ تین لوگوں برنارڈشا، چرچل اور ٹائن بی سے مصنف اپنی ملاقات کا اشتیاق ذکر کرتے ہیں اور قاری بے چین ہونے لگتا ہے کہ کب وہ ٹائن بی سے ملیں گے۔ اس حد تک پہنچانے کے بعد وہ اس جلسے کی روئداد ذکر کرتے ہیں جس کے وہ صدر تھے اور ٹائن بی مقرر۔ جلسے کے بعد اس سے نشست ہوتی ہے اور مصنف آٹوگراف البم نکال کر سامنے کردیتے ہیں۔ ٹائن بی نام لکھ کر تاریخ ڈالتے ہیں اور ہجری تاریخ کے لیے مصنف کی طرف دیکھتے ہیں، اور مصنف کی خاموشی سے وہ مشہور عام جملہ وجود میں آتا ہے کہ:

"اسلام کی تاریخ وہ لوگ کیوں کر بنا سکتے ہیں جنہیں تاریخ تک یاد نہ ہو، صرف باتیں بنانے سے کہیں تاریخ بنتی ہے۔ "

آخری خاکہ اس شخصیت کا ہے جس کا ذکر اس پوری کتاب میں جابجا بکھرا پڑا ہے اور جس کے ساتھ مصنف کی عقیدت عشق کی حد تک پہنچی ہے۔ ٹائن بی کے ذکر سے متصل اس خاکے کے شروعات میں شخصیت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"ٹائن بی تو محض ایک تاریخ دان ہے اور یہ دستخط ایک تاریخ ساز شخصیت کے ہیں۔ "

تمہید میں اپنی اس جملے کے اصل مورد سے قارئین کو آگاہ کرنے کے لیے پیچھے چلتے ہیں اور اسٹریچی ہال میں منعقدہ جلسے سے خطاب کرنے والے شعبۂ تعلیم کے صدر اے-بی-اے-حلیم کے استقبالیہ کا ذکر ہے جو وہ قائد اعظم کے لیے کرتے ہیں۔ کچھ آگے چل کر قائد اعظم کی

Downloaded From Tajassus.com

سیاسی زندگی کی شروعات کا بیان ہے اور اس موقع پر علامہ اقبال کی قائد اعظم سے توقعات کا ذکر ہے کہ ان کو قائد اعظم کی شکل میں مسلمانوں کا نجات دھندہ نظر آیا تھا۔ کڑی سے کڑی ملتی ہے اور علامہ اقبال کے حالات زندگی پر بحث ہوتی ہے، ان سے قاری کو متعارف کرواتے ہیں اور نظریہ پاکستان پر بات لے جاتے ہیں۔ ہندو مسلم تفریق، مسلمانوں کے جداگانہ تشخص اور اپنے لیے علیحدہ حکومت کے قیام کی کوششوں کا احوال ہے۔ بات ہوتے ہوتے پھر قائد کی طرف مڑتی ہے اور اس کا موازنہ مختلف شخصیات سے کرنے لگتے ہیں، ٹیپو سلطان، اورنگ زیب عالمگیر۔ فتوحات کا تقابل کیا جاتا ہے تو محمود غزنوی کا سومنات، شہاب الدین کا تھانیسر اور احمد شاہ ابدالی کا پانی پت۔ برصغیر کے مسلمانوں کا شیرازہ یکجا کرنے میں قائد اعظم کے کردار پر مفصل بحث قرطاس کی زینت بنتی ہے اور خاکہ مزید واضح ہونے لگتا ہے۔ مصنف اپنے اور قائد کے باہمی تعلق پر بات کرتے ہیں، کہ پہلی بار ان کو کہاں دیکھا۔ یہاں تک بات کرکے وہ اس جلسے کا ذکر کرتے ہیں جس میں انہیں قائد اعظم کا آٹوگراف ملا۔ پورے جلسے کا مفصل ذکر ہے اور آخر میں اس لمحات کی مکمل جزئیات نگاری ہے جب آٹوگراف البم قائد اعظم کی طرف بڑھائی۔

اس خاکے میں قائد اعظم سے جڑے چند مزید شخصیات کا ذکر بھی ہے۔ ان میں متصلا شروعات فاطمہ جناح کے ذکر سے ہوئی۔ ان سے ملاقات کا احوال ہے اور ان سے قائد کی نجی زندگی پر کیے گئے سوالات کا بیان۔ اسی نشست میں لیاقت علی خان بھی زیر بحث آتے ہیں تو مصنف قارئین کو ان کی شخصیت سے بھی روشناس کردیتے ہیں۔ آگے چل کر قائد اعظم کے ساتھ جڑے مصنف کے کچھ مزید واقعات کا ذکر ہے اور پھر تاریخ کے مخفی گوشوں پر بات چیت سے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اختتامیہ میں مصنف بڑی خوبصورتی سے قائد اعظم کی شخصیت کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

"قائد اعظم کی جانی پہچانی شخصیت میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو سمجھ میں نہ آئے۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک سیدھے سادھے آدمی تھے۔ ان کی خاص خاص خوبیوں کی فہرست کچھ یوں بنے گی، عزم - عمل - دیانت - خطابت اور خود داری۔ ایسے شخص کو غیروں نے سمجھا مگر مان کر نہ دیا اور اپنوں نے مانا مگر سمجھ کر نہ دیا۔ "

ANS 03

محمود ہاشمی اردو ادب میں ایک بڑا نام، تنقید نگار، مضمون نویس، مضف، ایڈیٹر، ڈرامہ نگار اور ایک بہترین استاد کی تمام خوبیاں آپ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

Downloaded From Tajassus.com

آپ کا تعلق میرپورآزاد کشمیر کے علاقہ ڈڈیال کے ایک گاؤں پوٹھہ بنگش سے تھا۔ آپ اگست 1920 ء کو متحدہ ہندوستان کی ریاست قلات میں پیدا ہوئے۔ جہاں آپ کے والد محترم ملازم تھے۔ آپ کا نام سلطان محمود رکھا گیا لیکن آپ نے بعد میں اپنے والد صاحب کے نام کی نسبت سے اپنا نام محمود ہاشمی تبدیل کیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ریاست قلات میں ہی حاصل کی۔ ان کے والد صاحب تعلیم یافتہ تھے اور ان کو مطالعہ کا شوق بھی تھا۔

ان کے گھر میں بہت سی کتابیں تھیں اور اس زمانے کے مشہور رسائل ”الہلال اور ابلاغ“ بھی آتے تھے۔ چنانچہ بچپن سے ہی سلطان محمود کا کتاب سے دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس دو ر میں سمجھ نہ آنے کے باوجود خواجہ حسن نظامی، راشد الخیزی اور بہت سے دوسرے مشہور مصنفین کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ 1930 ء میں والد کے انتقال کے بعد آپ کو قلات ریاست چھوڑ نی پڑھی۔ لہذا آپ اپنے آبائی گاؤں میں تعلیمی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے آپ اپنے ایک عزیز کے پاس گوجرہ فیصل آباد میں گئے اور وہاں سے میٹرک کا امتحان 1937 ء میں پاس کیا اور مزید تعلیم کے لئے جموں تشریف لے گئے لیکن وہاں ابتداء میں کچھ مشکلات پیش آئیں۔

لیکن بعد میں آپ کو پریس آف ویلز کالج میں داخلہ مل گیا۔ جہاں سے 1941 ء میں گریجویشن کرنے کے بعد آپ نے علی گڑھ سے ایم اے، ایل ایل بی کیا۔ جہاں پر آپ کو ممتاز ادیب اورماہر تعلیم جناب رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے والد محترم نے ریاست قلات کو نوکری کے دوران کافی سرمایہ کیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو دوران تعلیم کوئی مالی مشکلات پیش نہیں آئیں۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کو نوکری ملنے میں کافی دشواری پیش آئی۔ آپ کو تعلیم کے شعبے میں دلچسپی تھی۔ اسی میں ملازمت کے خواہاں تھے۔ ابتداء میں معمولی ملازمتوں کو ٹھکرا دیا اور کالج کی ملازمت کے لئے کوشش جاری رکھی۔ مئی 1944 ء میں آپ کا تقرر پرنس آف ویلز کالج جموں میں لیکچرار کے طور پر ہو گیا اور تقریباً ایک سال بعد امرسنگھ ڈگری کالج سری نگر میں تبادلہ ہو گیا۔ بعد ازاں آپ دوبارہ جموں کالج میں ملازمت کرتے رہے۔

آپ نے سکول اور کالج کے دور میں افسانے اور مضمون لکھنے شروع کر دیے جو کہ مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ آپ پرنس آف ویلز کالج جموں میں کالج کے محلہ ”توی“ کے مدیر تھے۔ کالج کی ملازمت کے دوران آپ افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ کشمیر کی تاریخ میں سب سے پہلے سٹیج ڈرامہ بھی آپ نے کیا۔ آپ کا ناولٹ ”موت کا جہنم“ 1946 ء میں چھپا۔ آپ نے مشہور روسی ادیب ”ٹالسٹائی“ کی کہانیوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔

Downloaded From Tajassus.com

اس کے علاوہ بہت سی کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ لیکن جو کچھ آپ نے 1947 ء اور 1948 ء میں دیکھا اور بعد کے حالات کے بارے میں اپنے احساسات کو اپنی کتاب کشمیر اداس ہے میں بیان کیا ہے۔ ابھی تک کشمیر کی آزادی کے واقعات جموں کی یادوں اور ہندوؤں کی زہنیت پر اس سے مستند کوئی کتاب کسی مصنف نے نہیں لکھی ہے۔

کشمیر کی آزادی کے دوران جموں میں مسلمانوں پر جو ظلم وستم ہوا۔ مہاجرین کے قافلوں پر جو حملے ہوئے اور اس دوران جو قتل و غارت اور خواتین کے اغواء اور عصمت دری کے واقعات ہوئے۔ آپ نے ان کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔ ان واقعات اور احساسات کو آپ اپنی شہرہ آفاق تصنیف۔ ”کشمیر اداس ہے“ میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہاشمی صاحب نے کشمیر اور کشمیریوں کی بے کسی، بے چارگی اور ان کے جذبات اور حساسات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ حکومتی ایوانوں میں ہونے والی سازشوں، سیاست دانوں کی قلابازیوں اور بھارتی فوج کی کشمیریوں کو دوبارہ غلامی میں جھکڑنے کی اس طرح منظر کشی کہ جنت بے نظیر کی جو حسین تصویر لوگوں کے ذہن میں نقش تھی۔ اس کی جگر ”کشمیر اداس ہے“ نے لے لی۔

پارٹیشن کے بعد آپ 1948 ء میں آزاد کشمیر تشریف لائے اور نوزائیدہ حکومت میں چیف پبلسٹی افسر کے طور پر ملازمت اختیار کی اور حکومت کے لئے بہت زیادہ کام کیا۔ لیکن پڑھنے پڑھانے میں زیادہ دلچسپی اور رجحان ہونے کی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر آپ 1952 ء میں گورنمنٹ کالج میرپور میں لیکچرار ہو گئے۔ اسی دوران ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے مختلف موضوعات پر تقریریں بھی نشر کیں۔ ایک سال بعد ہی آپ کو گورنمنٹ اور نیسٹل کالج مظفرآباد کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔

ستمبر 1953 ء آپ کی زندگی میں ایک اہم موڑ لے کر آیا اور آپ نے کالج کی ملازمت چھوڑ کر انگلستان کا سفر اختیار کیا اور پھر آپ وہی کے ہو کر رہ گئے۔ شروع کے کچھ سال مختلف شہروں میں گزار کر آپ 1956 ء میں برمنگھم آئے اوریہاں سکول میں تدریس کا آغاز کیا اورساتھ ہی ایم اے ایجوکیشن بھی کر لیا۔

1960 ء کی دیہائی میں پاکستان سے بہت سے لوگ ملازمت کی غرض سے انگلستان آئے اور مختلف جگہوں اور شہروں میں کام شروع کیا۔ زیادہ لوگ لندن میں آباد ہوئے۔ آپ نے محسوس کیا کہ ایشیائی پاکستانی لوگوں میں رابطے کے لئے کوئی ذریعہ ہونا چاہیے جس کے لئے اپریل 1961 ء میں آپ نے اردو اخبار ”مشرق“ کا آغاز کیا جو کہ برطانیہ اور یورپ میں اردو زبان کا پہلا اخبار تھا۔ یوں آپ کا شمار مغرب میں اردو صحافت کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس سے قبل برطانیہ میں اردو زبان بولنے والے بھی ہزاروں میں تھے۔ اردو صحافت کا سورج برطانیہ میں

Downloaded From Tajassus.com

"مشرق" سے طلوع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمود ہاشمی نے تقریباً بارہ سال تک تمام نامساعد حالات میں "مشرق" لندن کا اجراء بڑی باقاعدگی سے جاری رکھا۔

1973 ء میں مشرق اخبار کی نظامت اور چیف ایڈیٹر شپ سے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر سے درس و تدریس کی طرف توجہ کر لی اور ساتھ ہی برمنگھم سے نکلنے والے ایک مقامی اخبار کی ایڈیٹر شپ سنبھال لی۔ اخبار کا نام "سالٹلے نیوز" تھا۔ اسی دوران آپ نے "ایک گھر بنانا چاہیے" تصنیف کی۔

1979 ء میں برطانیہ کے شہر "پیٹربروہ" میں اردو کے استاد کی آسامی کا اشتہار دیکھا تو اپلائی کیا اور جس عمر میں لوگ ریٹائرمنٹ کا سوچتے ہیں آپ نے دوسرے شہر میں جا کر ملازمت اختیار کر لی۔ چونکہ آپ کو درس و تدریس سے دلی لگاؤ تھا۔

پانچ سال یہاں پر اردو کے استاد کے طور پر کام کیا۔ اس دوران برطانیہ کے رہنے والے ایشیائی بچوں کے لئے اردو کا قاعدہ تصنیف کیا جس سے بچوں کو اردو پڑھنے لکھنے میں بہت آسانی ہوئی۔ 1984 ء میں آخر کار آپ نے ریٹائرمنٹ لے لی اور پڑھنے لکھنے کا کام آخری برسوں تک جاری رکھا۔

آپ میں رکھ رکھاؤ اور وضع داری بدرجہ اتم موجود تھی۔ لیکن آپ کسی قسم کی بناوٹ اور تکلف سے کوسوں دوعر رہے۔ گفتگو میں نرمی اور دھیما پن تھا۔ مجلس رسمی اور بڑی ہو یانجی اور غیر رسمی آپ کی گفتگو کی سادگی برقرار رہتی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ تمام عمر تقریباً اپنے آبائی وطن ڈڈیال سے باہر گزارنے کے باوجود اپنے گھر کے افراد اور دوسرے اہل میرپور سے گفتگو میں آپ کا لہجہ ٹھیٹھ میرپور ہوتا تھا۔ مزاج میں سادگی، ملنساری، نرم گفتاری اور خوش خلقی کی وجہ سے ہمیشہ سے ہر خاص و عام کی نظرمیں محترم رہے۔

فن شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے اور سچے مصنف کی شخصیت، اس کی سوچ، لفظوں کا انتخاب اور بیان کے اسلوب میں بول رہی ہوتی ہے۔ یہ بات محمود ہاشمی پر بالکل صادق آتی ہے۔ ان کے بارے میں قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے کہ وہ ایک پیدائشی ادیب ہیں اور محمود ہاشمی واقعی ایک پیدائشی اور فطری ادیب ہیں اور ادب سے ان کا عشق "پون" صدی تک جاری رہا۔ درس و تدریس اور صحافت کا ادب سے گہرا تعلق ہے۔ آپ نے ان تینوں شعبوں میں کام کیا اور سب میں کمال عروج تک پہنچے۔ آپ کی شخصیت اور نگارشات پر لکھنے کے لئے یہ مختصر سا مضمون کافی نہیں ہے بلکہ ان کے فن اور شخصیت پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہے۔ ان ی ادبی کاوشوں، تصنیفات اور تحقیق پر کئی مقالے لکھے جا سکتے ہیں جو کہ میرے جیسے کم علم کے بس کی بات نہیں۔

ANS 04

Downloaded From Tajassus.com

غالب کی شخصیت جامع الصفات تھی وہ ایک شاعر کی حیثیت سے معروف تو ہیں ہی، ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بلند ہے۔ ان کے خطوط اردو میں جد ید نثر کا سنگ بنیاد ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی چند ایک کتابیں ہیں۔ شاعری میں غالب نے قصیدے لکھے اور مثنویاں وغیرہ بھی لیکن جس صنف کی وجہ سے غالب، غالب ہیں وہ ان کی غزل ہے۔ دیوان غالب کا زیادہ تر حصہ غزلوں پرمشتمل ہے۔ " دیوان غالب " کا پہلا ایڈیشن اکتوبر 1841 میں مطبع " سید الاخبار " دہلی سے شائع ہوا جب کہ لگ بھگ آٹھ سال قبل 1833ء میں غالب اس کو مرتب کر چکے تھے۔ اس کے بعد غالب کی زندگی میں ان کے دیوان کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔

غالب کو فارسی اور اردو، دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ انھیں اردو سے زیادہ اپنی فارسی دانی پر فخر تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے ہوئے اردو شاعری کو " بے رنگ من است " کہا تو کبھی اردو شاعری کو رشک فارسی قرار دیا۔ ابتدا میں وہ فارسی شاعر بیدل کی پیروی کرتے تھے۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

طرز بیدل میں ریختہ کہنے کے باعث ان کے کلام میں فارسی کی آمیزش زیادہ ہوئی، ابہام اور اشکال بھی پیدا ہوئے معمائی کیفیت بھی در آئی۔ مثلا یہ اشعار :

شمار سبحہ ، مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

اس نوع کی شاعری نے غالب کے کلام میں چیستانیت اور الجھاؤ کی کیفیت پیدا کردی اور لوگ کہنے لگے کہ یہ اپنا کہا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔ ابتداً غالب نے اس بات کو یہ کہہ کر اڑا دیا کہ

نہ ستائش(تعریف) کی تمنا ، نہ صلے(بدل) کی پروا
نہ سہی گر میرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن بعد میں ان کے قریبی احباب جن میں مولانا فضل حق خیرآبادی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، غالب کو اس مشکل پسندی سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ان کی بعد کی غزلوں میں مشکل پسندی کم ہوگئی اور بالعموم ان کے کلام میں سادگی، سلاست اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہو:

Downloaded From Tajassus.com

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
عرضِ نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
بسکہ دشوار(مشکل) ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا(دن رات) مرے آگے

- مرزا غالب کی حالات زندگی

غالب کی کامیابی کا باعث ان کی صرف عام فہم الفاظ، تراکیب اور سیدھے سادھے طرز کی شاعری نہیں بلکہ مجموعی طور پر ان کا ڈکشن ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب، مصرعوں کا در و بست، زندگی اور زمانے کے تعلق سے ان کا رویّہ انسانی جذبات و احساسات کا درک، ان کے اشعار کی معنویت اور تہہ داری، ان کا پیرایۂ اظہار اور ان کا انداز بیان، ان کے کلام کو وزن و وقار بھی عطا کرتا ہے اور مقبولیت اور محبوبیت بھی۔ غالب کو الفاظ کے انتخاب میں بڑا کمال حاصل تھا۔ ہر چند کہ انہوں نے کہا ہے :

آتے ہے غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

- میر تقی میر کی غزل گوئی
- خواجہ حیدر علی آتش کی غزل گوئی
- ولی دکنی کی غزل گوئی

لیکن ان مضامین کو اشعار کی صورت میں پیش کرنے کے لئے الفاظ کے انتخاب کا ہنر کچھ ان ہی کو آتا تھا۔ غالب الفاظ کے مزاج شناس تھے۔ ان کا دعویٰ بے جا نہیں کہ :

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

Downloaded From Tajassus.com

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

- غواصی کی غزل گوئی

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو دیوان غالب کے پہلے شعر ہی پر نظر پڑتی ہے
نقش فریادی(دہائی) ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ہمارے شارحین نے اس شعر کی جو تشریحات کی ہیں اور جو نئے نئے معانی نکالے اور مفاہیم پیدا کیے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے اس شعر میں معنی مفہوم کی ایک دنیا آباد کردی ہے۔ ذیل کے اشعار میں بھی غالب کا یہ ہنر نمایاں ہے :

سراپا رہنِ عشق و ناگزیر الفت سہی
عبادت برق'بجلی' کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار باد یاں
رہا آباد عالم اہلِ ہمت جے نہ ہونے سے
بھرے ہے جس قدر جام و سبو، مے خانہ خالی ہے

غالب کے کلام کی ایک اور خصوصیت ان کا انداز بیان ہے۔ اپنے انداز بیان پر ناز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور(بات کرنے والے) بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں(شعر کا انداز) اور

مرزا غالب اور مسائل تصوف

غالب کا انداز بیاں ہی ہے جس نے ایک عالم کو گرویدہ کر لیا ہے۔ ان کے اشعار کا ڈکشن منفرد ہے۔ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ غالب کے یہاں فکر اور موضوع کچھ اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ان کے اسلوب میں طرح داری بھی پیدا ہو جاتی ہے اور تہہ داری بھی۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں ندرتِ خیال بھی ہے اور انداز بیان کی شگفتگی اور شستگی بھی :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

Downloaded From Tajassus.com

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ(موت) علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر(صبح) ہونے تک

عشرتِ قتل گہہ اہل تمنا مت پوچھ

عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

ANS 05

مرزا اسد اللہ خاں غالب 27دسمبر 1797ءمیں دریا گنج آگرہ بھارت میں پیدا ہوئے۔شعر و ادب کے اس عظیم المرتب شاعر کے خاندان کے متعلق شنید ہے کہ یہ ترک خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد حکومت میں ماورالنہر سے ہندوستان میں آئے تھے۔ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان تھے۔پانچ سال کی عمر میں یہ عظیم شاعر والد کے سائے سے محروم ہو گیا تھا۔مرزا اسد اللہ غالب کی شادی محض 13سال کی عمر میں امرو بیگم سے ہوئی۔ ان کے ہاں سات بچوں کی ولادت ہوئی مگر ان میں سے کوئی بھی حیات نہ رہا۔ شادی کے بعد غالب نے دہلی کو اپنا مسکن بنایا۔ اور اپنی شادی کے بندھن کو عمرقید سے تعبیر کیا۔

قید حیات و بند و غم، اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مرزا اسداللہ غالب فارسی اور اردو میں بیک وقت سخن سرائی کرتے تھے۔ اپنے منفردانداز بیان اور طرز تحریر کی وجہ سے اپنے ہم عصر شاعروں میں منفردمقام و پہچان رکھتے۔استاد ابراہیم ذوق اور مومن خان مومن بھی نمایاں تھے ۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق

رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

غالب ہمارے ان خوش قسمت مشاہیر میں سے ہیں جن کی شاعری ، شخصیت اور ادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ با ایں ہمہ اہل علم حضرات کی علمی و ادبی تحقیقات اس باب میں برابر جاری ہیں جس کے نتیجہ میں ہم مرزا غالب کے محسن کلام اور ان کی فنی خوبیوں کے نئے نئے گوشوں سے آشنا ہوتے رہتے ہیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پسندیدگی اور مقبولیت کے کیا اسباب ہیں؟کہنہ صرف ذی علم حضرات بلکہ معمولی اردو جاننے والے بھی مرزا کی شخصیت اور کلام سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے بے شمار اشعار اور مقطعے

Downloaded From Tajassus.com

زبان میں اس طور پر داخل ہوگئے ہیں کہ وہ زبان ہی کا ایک جز بن گئے ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ان اشعار سے ہماری زبان اور کان نا آشنا نہیں ہیں - نجی صحبتوں سے لے کر علمی اور ادبی گفتگو تک ہر موقع اور مقام پر یہ اشعار تکرار کے ساتھ سننے میں آتے ہیں اور لذت کام و دہن میں اضافہ کرتے ہیں - اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مرزا ایک بلند پایہ شاعر تھے توا ن کے معاصرین میں اسی قبیل کے اور بھی شاعر اور باکمال حضرات گزرے ہیں- لیکن خاص و عام میں ان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہے جو مرزا غالب کی ذات کوہے-

مرزا کی سوانح سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ ابتدائے سن بلوغ سے لے کر عالم پیری و حیات دنیوی کے اختتام تک شدائد و مشکلات کے باوجود جن انوکھے طریقوں سے انہوں نے اپنی بلند شخصیت کا جا بجا اظہار کیا ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی ذات انفرادیت کے احساس سے ہر دم معمور رہتی تھی- طرز بیدل میں شعر کہنا بھی انفرادیت کے شدید احساس کی وجہ سے تھا اور اس کا ترک کرنا بھی اس وجہ سے کہ ان کی انفرادیت نے اپنا ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا-

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

مرزا صاحب کی شخصیت کے مطالعے کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ دنیا میں جس قدر عظیم فن کار اور ارباب کمال گزرے ہیں ان میں سے بیشتر کی زندگی اور فن میں کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فن کاراپنی شخصیت

Downloaded From Tajassus.com

و کردار کے کمزور پہلوؤں کو جنھیں زمانے کی معاشرت، اخلاقی قدروں کے منافی خیال کرتی ہے۔

منظراک بلند ی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یوں غالب فارسی اور اردو کے شاعر کے طورپر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ لیکن نثر میں بھی کمال انداز تحریر اپنایا جو پڑھنے والوں کو تحریر کے اختتام تک جکڑے رکھتا ہے۔ مکاتیب غالب ، مرزا غالب کی پر تاثیر تحریر کے اعلیٰ شاہ پارے ہیں۔ غالب نے ہی خط کو آدھ ملاقات قرار دیا۔ اور خط تحریر کرتے ہوئے ایسا انداز متعارف کرایا کہ گویا جس کے لیے خط لکھا جارہاہے وہ سامنے بیٹھا سب دیکھ رہاہے۔ مرزا غالب بے پناہ صلاحیتوںکے مالک اور ظریفانہ مزاج کے حامل انسان تھے۔ حاضر جوابی بھی مرزا غالب کا ایک خاصہ تھی۔ مرزا غالب کو جتنی پذیرائی اس کی کی زندگی میں ملنی چاہیے تھی نہیںملی وہ خود بھی اپنے آپ کو آنے والے زمانے کاشاعر کہتے تھے۔غالب کو ایک نئے عد کی تشکیل کا پورا پورا احساس تھا اور وہ جدید عہد کے مضمرات کو قابل قدر جانتے تھے ان کے خیال میں مردہ پروری مبارک کام نہ تھا وہ مستقبل کی جانب نظر رکھتے تھے اور یہ انداز نظر ان کی بالیدگی طبع پر دلیل ہے اور ان کے سماجی مزاج کا ترجمان ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ہم نے مانا کہ تغافل یہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غالب نے اردواور فارسی زبان میں کئی شہکار شعر تخلیق کیے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا اسد اللہ غالب کی خود نوشت یادگاہ غالب کے عنوان سے تحریر کی.

Downloaded From Tajassus.com